# سُورَةُ الْعَصْر

سورۃ العصر مکی ہے، یہ چھوٹی سی سورۂ مبارکہ معنی اور مطالب کے لحاظ سے بڑی جامع ہے، امام شافعیؒ کا یہ قول مشہور ہے کہ تنہا اسی سورۃ پر لوگ غور وفکر کریں تو یہ ان کی ہدایت اور تعلیم، کامیابی اور کامرانی کے لیے کافی ہے اس میں دین کی پوری دعوت آ گئی ہے اور فلاح دارین کا مکمل پروگرام بتا دیا گیا ہے، رب کریم کے ان گنت انعامات میں سے قرآن بہت بڑا انعام ہے جو خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا اور یہ سورۃ پورے قرآن کا خلاصہ ہے۔

# سُورَۃُ الْعَصْر

آیات:۳ رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالۡعَصۡرِ(۱) اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ(۲) اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ(۳)﴾

زمانے کے حالات شاہد ہیں کہ انسان درحقیقت گھاٹے اور خسارے میں ہے مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے، صالح اعمال کیے اور باہم حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے

﴿وَالۡعَصۡرِ﴾ زمانے کے حالات شاہد ہیں، (قسم ہے زمانے کی)۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اس کی عظمت یا اس کے کمالات وعجائب کی بنا پر نہیں کھائی ہے بلکہ اس بنا پر کھائی ہے کہ وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے پس زمانے کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جن میں یہ چار صفتیں پائی جاتی ہیں: (۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔'' (تفہیم القرآن)

مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبر قرآن'' میں مولانا فراہیؒ کے حوالے سے ''والعصر'' پر لکھتے ہیں:

''لفظ عصر'' ایک طرف زمانہ گزشتہ کے احوال وواقعات یاد دلا رہا ہے، دوسری طرف اس کی مخصوص

صفت تیز روی اور برق رفتاری کی طرف بھی متوجہ کر رہا ہے، ان دونوں حقیقتوں کی طرف اشارہ سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں، ایک یہ کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے ان کے اعمال کے اعتبار سے نافذ ہوں گے، دوسرا یہ کہ ہم کو زمانے سے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تیز روی اور برق رفتاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اس حقیقت کو مولانا فراہیؒ اس مثال سے بھی سمجھاتے ہیں۔

اس معاملے میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے، لیکن بجائے اس کے کہ جلد سے جلد اس کو بیچ کر اپنے دام کھرے کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا دیکھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے ناعاقبت اندیش تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

مولانا فراہیؒ پھر بتاتے ہیں:

''علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے، وہ اس طرح کہ اس تھوڑی سی مدت میں اگر انسان چاہے، تو اجر وثواب کا ایک لازوال خزانہ جمع کر سکتا ہے، ایک بدبخت انسان اس حیاتِ فانی کی چندروزہ لذتوں میں ریجھ کر اپنے آپ کو ابدی مسرت وکامیابی سے محروم کر لیتا ہے، لیکن ایک عاقل اسی فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب اور برقِ خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبطِ نفس کی آزمائشیں جھیل کر...... اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی تخت وتاج حاصل کر لیتا ہے۔'' (تدبر قرآن)

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ﴾ <u>انسان درحقیقت گھاٹے اور خسارے میں ہے۔</u>

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ وہ اصل بات ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے، جب ایک طرف مہلتِ حیات کی اہمیت اور قدر وقیمت کا حال یہ ہے کہ اسی کے بدلے میں انسان ابدی بادشاہی حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس سے غفلت برتے تو اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ دوسری طرف اس کی تیز روی کا یہ

حال ہے کہ ہر سیکنڈ کے ساتھ وہ ماضی کے اندر تحلیل ہوتی جارہی ہے اور اس پر انسان کا کوئی قابو نہیں تو وہ سارے انسان انتہائی خسارے میں ہوئے جن کا راس المال اس تیزی سے برباد ہورہا ہے اور وہ اس سے غافل ہیں، چنانچہ اس کو شہادت میں پیش کر کے فرمایا کہ انسان گھاٹے میں ہیں بجز اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے۔'' (تدبر قرآن)

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے۔

ایمان کی سب سے بڑی حقیقت تو رب کائنات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو زبان کے اقرار اور دِل کے یقین کے ساتھ ماننا اور اس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کرنا پھر ساری زندگی اسی کی اطاعت اور فرمانبرداری کا دم بھرنا ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''الایمان، تصدیق کرنا، ماننا یا اصطلاحی معنوں میں اسلامی عقائد وارکان کی سچائی کو دل سے تسلیم کرنا اور زبان سے اس کا اظہار کرنا، اسلام نے ایمان کا جو تصور پیش کیا ہے وہ زبردستی اطاعت و فرمانبرداری کا نام نہیں بلکہ اس عقیدے اور نظریہ کو قبول کر لینے کا نام ہے جس کو ذہن وقلب میں سمو لینے سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، ایمان ہمیں کس درجہ اقدار سے مالا مال کرتا ہے، اس کا اندازہ ان پانچ باتوں سے ہوتا ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیہ مبارکہ میں ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرة:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کو قبلہ سمجھ کر ان کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، روزِ آخرت پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائیں۔''

یہ پانچ بنیادی باتیں ہیں: (۱) اللہ پر ایمان (۲) آخرت پر ایمان (۳) فرشتوں پر ایمان (۴) کتب پر ایمان اور (۵) نبیوں پر ایمان۔

جب ہم اللہ پر ایمان لے آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم زندگی کے مطمح نظر کو پا گئے اور اس رب

کریم سے اپنا رشتہ جوڑ لیا جو تمام اقدارِ حیات کا منبع و سرچشمہ ہے، جو ہمہ خیر، ہمہ حسن اور ہمہ خوبی ہے، اس طرح گویا زندگی کو ایک سانچہ ملا اور ایک راہ متعین ہوئی جو نیکی، جمال اور حسن و خوبی کی راہ ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے یہ معنی بھی ہیں کہ ہمارا احساسِ تنہائی و بیچارگی ختم ہوا اور ہم نے ایک ایسا مضبوط سہارا ڈھونڈ لیا جو نشیب و فرازِ حیات میں ہماری مدد کرسکتا ہے۔ یہی ہے جو ہماری ضرورتوں سے آگاہ ہے اور ہماری دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے، جو دکھ درد میں ہمارے زخموں پر پھاہا رکھتا ہے اور مصائب و مشکلات میں ہماری راہنمائی کرتا اور نجات و مخلصی کی راہ سجھاتا ہے۔

ایمان بالآخرت نے ہمیں موت کے ڈر سے آزادی بخشی اور اخروی زندگی کے بارے میں یقین دلایا کہ یہ رواں دواں جاودانی ہے، اس عقیدے سے ہم میں احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگر آخرت کا تصور صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دن ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا اور اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں جواب دینا ہے۔

ملائکہ پر ایمان سے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ دراصل اس کائنات میں ارادۂ الٰہی کی حکمرانی ہے نیز یہ کہ مادہ ہی سب کچھ نہیں بلکہ مادی سطح کے علاوہ وجود کی اور سطحیں بھی ہیں۔

کتاب پر ایمان لانے سے ہمیں یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ قانونِ فطرت جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے ہمیں الفاظ و حروف کی صورت میں ایک مدوّن و مرتب شکل میں مل جاتا ہے۔

انبیاء و رسل کے وجود کو تسلیم کرنے سے دانش و حکمت کے ان نہایت ہی قیمتی خزانوں سے ہم آشنا ہو جاتے ہیں جن سے ہزاروں نبی اور رسول اپنے اپنے دور میں بہرہ مند رہے، ان پر ایمان کے یہ معنی بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عنایت نے کسی دور میں بھی انسان کو رشد و ہدایت کی برکات سے غافل نہیں رکھا۔" (لسان القرآن، ج:۱)

**﴿وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾** اور نیک اعمال سرانجام دیے۔

اس سے مراد وہ سب اعمال ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں حکم دیا، یا جنہیں خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے ترغیب دی، اس کا دائرہ بہت وسیع

ہے۔اس میں نماز، روزہ، حج، صدقات وزکوٰۃ، اخلاص اوراحسان جیسی عبادات بھی داخل ہیں اوراچھے معاشرتی آداب بھی شامل ہیں جیسے والدین کی خدمت، پڑوسیوں سے حسن سلوک، بیماروں کی عیادت اوران کی تیمارداری، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت، غربا ومساکین کی خدمت اوراعانت، تجارت میں دیانت اور امانتداری، معاملات میں نیک نیتی اور کھرا پن وغیرہ تمام امور اعمال صالحہ میں شمار ہوتے ہیں۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''عمل صالح ایمان کا فطری وطبعی ثمرہ ہے، جونہی انسانی قلب میں ایمان کی حقیقت جاگزیں ہوتی ہے،اسی لحہ وہ عمل صالح کی شکل اختیار کر لیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک ایجابی متحرک حقیقت ہے، جونہی یہ حقیقت دل میں پیوست ہوتی ہے وہ بذات خود عمل صالح کی صورت میں خارج میں نمودار ہوتی ہے، اگر ایمان یہ فطری حرکت اختیار نہیں کرتا تو وہ مصنوعی یا مردہ ایمان ہے، ایمان کی مثال پھول کی طرح ہے، پھول اپنی خوشبو روک نہیں سکتا، خوشبو طبعی وفطری طور پر اس سے پھوٹ کر رہے گی۔ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ابھی دل میں موجود نہیں ہے۔

اسی سے ایمان کی قدر وقیمت سامنے آتی ہے، وہ حرکت وعمل ہے، وہ بناوتعمیر ہے،اس کا رخ اللہ کی طرف ہے، وہ دل کی مخفی حالتوں میں سے کوئی سلبی ومنفی حالت نہیں جو اپنے اندرون میں سمٹ کر رہتی ہو، وہ کوئی معصوم سا جذبہ بھی نہیں جو حرکت وعمل کی صورت میں نمودار نہ ہوتا ہو، وہ اسلام کی نمایاں قوت ہے جس سے عملی زندگی میں عظیم تعمیر کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔

یہ بات اسی وقت تک ہے، جب تک ایمان نظام الٰہی سے عملاً مربوط ہے...... یہ نظام عملی زندگی سے تعلق رکھنے والی ایک دائمی حرکت ہے جو نظم اور منصوبہ کے تحت وجود میں آتی ہے اور ایک خاص غرض و غایت کی طرف اس کا رخ ہوتا ہے، نوع انسانی کے لیے ایمان کی قیادت یہ ہے کہ حرکت کے اس نظام کو، جو عین کائنات کی فطرت ہے قائم ومضبوط کیا جائے، ایک عمدہ، پاکیزہ اور تعمیری تحریک جو اس نظام کے لائق ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے صادر ہوا ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ، وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ﴾

اور باہم حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''جن چار چیزوں پر انسان کی فلاح اور کامیابی کا دارومدار ہے ان میں تیسری اور چوتھی چیز ''تواصی بالحق اور تواصی بالصبر'' ہے یعنی حق اور صبر کی وصیت وتاکید کرنا۔''حق'' سے مراد ہر وہ اچھی بات اور ہر وہ اچھا کام ہے جس میں ایمان اور عمل صالح کے سارے شعبے شامل ہیں اور صبر کا مطلب ہے نفس پر قابو رکھنا اور ناموافق حالات میں بھی حق پر قائم رہنا، اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تواصی بالحق کا مطلب ہوا دوسروں کو ایمان وعمل صالح اور ہر اچھی بات اور اچھے کام کی نصیحت ووصیت کرنا، اسی کا دوسرا عنوان ''امر بالمعروف'' ہے، اور تواصی بالصبر کا مطلب ہوا نفس کو قابو میں رکھنے کی اور معصیتوں سے اس کو روکے رکھنے کی دوسروں کو تاکید ووصیت کرنا، اس کا دوسرا عنوان ''**نھی عن المنکر**'' ہے۔

تو معلوم ہوا کہ خسارے اور ناکامی سے محفوظ رہنے اور فلاح وکامیابی حاصل کرنے کے لیے جس طرح ایمان لانا اور اعمال صالحہ کرنا شرط ہے اسی طرح دوسروں کو ایمان وعمل صالح کی اور اچھی باتوں اور اچھے کاموں کی دعوت دینا اور اس کی وصیت وتاکید کرنا اور ہر طرح کی معصیتوں اور برائیوں سے نفس کو روکنے کی نصیحت ووصیت کرنا بھی ضروری ہے، یہ بھی ہمارے فرائض میں ہے اور اپنے اپنے حالات کے مطابق ہم اس کے مکلّف ہیں، واقعہ یہ ہے کہ عمل صالح کے وسیع دائرہ میں ''امر بالمعروف'' اور ''نھی عن المنکر'' بھی شامل ہیں، چونکہ ہم بندوں کو یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے نفس کے ذمہ دار ہیں دوسروں کے ذمہ دار نہیں، اس لیے ''تواصی بالحق'' اور ''تواصی بالصبر'' کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔'' (درس قرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اس سورۂ مبارکہ سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس شخص میں ایمان نہیں ہے، جو رب کائنات کی غلامی میں نہیں آتا، اس کے عمل میں راست بازی اور سچائی نہیں ہوتی، وہ صبر وانصاف

ایسی خوبیوں سے محروم ہوتا ہے اوران باتوں سے تہی دامن ہونا شرف انسانیت کوضائع کرنا ہے اور یہ بہت بڑے خسارے کی بات ہے۔

۲) ''ایمان'' ہمیں امن وسلامتی سے ہمکنار کر دیتا ہے، اعمال صالحہ اس ایمان کو پروان چڑھاتے ہیں اور اسے مضبوط اور توانا بناتے ہیں۔ایمان کی مثال بیج کی ہے جو دل کی زمین میں بویا جاتا ہے اور اعمال صالحہ سے وہ بیج پھوٹتا ہے اور خوشنما پودے کی شکل میں ظاہر ہوتا، وقت کے دھارے کے ساتھ وہ پھلتا پھولتا اور تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے پھر اس کے گھنے سایہ میں لوگ راحت وآرام پاتے ہیں گویا مؤمن کی زندگی شجرِ سایہ دار کی سی ہوتی ہے، وہ اس خوشگوار زندگی میں دوسرے انسانوں کو بھی شامل کرنا چاہتا ہے، اس لیے تواصی بالحق کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

۳) شیطان اور نفس اس راہ میں آڑے آتے ہیں، مصائب ومشکلات کا سامنا ہوتا ہے، اللہ پر مضبوط ایمان اسے استقامت اور قوت عطا کرتا ہے، وہ صبر اور سلامتی سے اس منزل کو عبور کر لیتا ہے اور ساحل مراد سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

۴) ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ایک ایسی مضبوط زنجیر ہے کہ اسے درمیان میں کہیں سے بھی ٹوٹنا نہ چاہیے، اس میں جہاں بھی خلا پیدا ہوگا، یہ زنجیر کمزور ہو جائے گی اور سالک کے لیے منزل مقصود پر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔

..................o..................